***Journal of Religion & Society* (JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.21745053

Ghalib's philosophical elegance, regret, and intellectual delights

غالب کی فلسفیانہ ظرافت، پشیمانی اور ذہنی لطافتیں

Dr. Uzma Noreen*
Lecturer Urdu Department G.C Women University Sialkot
uzma.noreen@gcwus.edu.pk

Abstract

Mirza Ghalib is a great poet of Urdu poetry whose ghazals express philosophical depth, elegance, regret and mental subtleties in a unique way. His poetry is not just an expression of emotions but a mirror of contemplation on the complex issues of human existence, destiny, love, life and the universe.

In Ghalib's poetry, philosophy does not come in a dry and serious manner but is expressed with elegance and humor. He also describes the bitter realities of life in such a way that the reader is forced to smile. His elegance is not just humor but a deep consciousness adorned with thought and wisdom.

The aspect of regret and remorse is also prominent in Ghalib's poetry. He admits human weaknesses, desires and failures. In his case, this regret is not just regret but an expression of deep awareness of human psychology. He describes his mistakes and deprivations with great dignity.

Ghalib's greatest characteristic is his mental subtlety and point-making. He presents common ideas in an extraordinary way. His poems have many layers of meaning that each reader discovers according to his understanding. Ghalib has a beautiful blend of intellect and passion, philosophy and poetry, seriousness and elegance. He ponders the mysteries and symbols of life but does not allow his poetry to become dry philosophy. This is why his ghazals retain aesthetic beauty along with intellectual depth.

Key Words: Mirza Ghalib, Ghazal, express Philosophical depth, Elegance, Regret, Mental subtleties, Common ideas, Extraordinary way.

غالب کے ہاں فلسفیانہ ظرافت کے کئی پہلو نمایاں ہیں۔ لیکن فلسفے کے بوجھل اور سنجیدہ ایوانوں میں ظرافت ایک ایسی روشن کھڑکی کی مانند ہے جس کے کھلنے سے فکرِ انسانی کو ایک تازہ اور دلکش رخ ملتا ہے۔ کائنات کے لایعنی پن، انسانی نادانیوں اور زندگی کے تضادات پر جہاں روایتی فلسفہ سر دھنتا ہے وہاں ظرافت ان کڑوی سچائیوں کو دانشمندی کی چاشنی میں ڈبو کر قابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ یہ عقل کے اس جمود اور غرور کو توڑتی ہے جو حد سے زیادہ گہرائی کے باعث ذہن پر بوجھ بننے لگتا ہے۔ اور انسان کو یہ یاد دلاتی ہے کہ اپنی تمام تر داناؤں کے باوجود وہ بہر حال ایک کمزور اور خطاکار مخلوق ہے۔ سقراط کے طنزِ مزاح سے لے کر وجودیت کی الجھنوں تک، ظرافت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنی فکری کج رویوں کو دیکھ کر شرمندہ ہونے کے بجائے مسکرا اٹھتا ہے۔ یہ دراصل فلسفے کا وہ خوبصورت اور ہلکا پھلکا لباس ہے جو خشک نظریات کو عام انسان کے لیے دیدہ زیب بناتا ہے؛ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی دانشور اپنی گہری بات کہتے کہتے مڑ کر دھیمے سے مسکرا دے، جس سے بات کا وزن کم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی سچائی براہِ راست دل میں اتر جاتی ہے۔ اس ضمن میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

"ہے مشتمل نمود صور میں وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج حباب میں"۔ ا

مولانا الطاف حسین حالی اور غلام رسول مہر کے ارشادات کی روشنی میں غالب کے اس صوفیانہ کلام کی تفہیم بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شعر دراصل تصوف کے مشہور نظریے "وحدت الوجود" اور کائنات کی عارضی حیثیت کی ایک لاجواب تمثیل ہے۔ مولانا حالی کے نزدیک غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قطرے، موج اور بلبلے کے مٹ جانے والے وجود کو بیان کرنے کے لیے کسی مشکل فلسفیانہ اصطلاح کے بجائے اردو کے ایک نہایت سادہ اور روز مرہ محاورے "یہاں کیا دھرا ہے" کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا کہ وہ بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ بن گیا۔ ان کے الفاظ میں۔

"یہ شعر وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کو ہیچ اور ناچیز ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ "یاں کیا دھرا ہے"، منتہائے بلاغت ہے۔ ۲

اسی فکری گہرائی کو مزید آسان کرتے ہوئے غلام رسول مہر یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ پانی کی ان مختلف صورتوں کی اپنی کوئی مستقل ہستی نہیں ہوتی، بلکہ ان کا سارا وجود سمندر کے مرہونِ منت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

"قطرہ، موج اور بلبلے کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی، یہ تو سمندر میں چند صورتیں ہیں جو عارضی طور پر نمایاں ہو گئیں اور ان کی ہستی سمندر پر موقوف ہے۔ ۳

وہ فلسفے کی رو سے یہ حقیقت سامنے لاتے ہیں کہ کائنات میں حقیقی اور ابدی ہستی صرف "واجب الوجود (اللہ تعالیٰ)" کی ہے۔ جبکہ کائنات کی دیگر تمام مادی چیزیں ممکنا تمیں سے ہیں۔ جو عارضی طور پر نمودار تو ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت سمندر میں بننے اور مٹنے والے ایک عارضی بلبلے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اسی طرح مولانا طباطبائی کے مطابق اس تمثیل کی غرض یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی کو واجب الوجود کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

"اس تمثیل کی غرض یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی کو واجب الوجود کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔"۔ ۴

آپ کا یہ خیال نہایت پُر لطف اور صائب ہے کہ غالب کے اس شعر پر ان تینوں مایہ ناز شارحین—مولانا حالی، غلام رسول مہر اور طباطبائی—کی آرا سنجیدگی کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترتی ہیں، اور موضوع کی نزاکت کے پیشِ نظر ایسا ہونا بالکل فطری بھی ہے۔ مگر اس گہری سنجیدگی کے پس پردہ اگر غور کیا جائے تو ایک لطیف ظرافت بھی خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے، جس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ کٹھن سے کٹھن اور خشک ترین علمی مباحث بھی ظرافت کے تڑکے کے بغیر اپنے مکمل اور پر اثر اظہار سے محروم رہتے ہیں۔ ظرافت کا یہی وہ رنگ ہے جو کائنات کی بے ثباتی پر روایتی ماتم کرنے کے بجائے، انسان کو اپنی ہی بے حقیقت ہستی (قطرہ، موج اور حباب) پر ایک فلسفیانہ مسکراہٹ عطا کرتا ہے، اور ثابت کرتا ہے کہ جہاں عقل کی سنجیدگی ختم ہوتی ہے، وہاں سے ظرافت کا اصل سحر شروع ہوتا ہے۔ ظرافت کا اصل سرچشمہ دراصل انسان کا اپنا بلند ظرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحث چاہے کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، انسان کا یہ اندرونی ظرف اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی بہترین مثال خود مولانا حالی کی تشریح ہے۔ انہوں نے اگرچہ اس شعر کو "وحدت الوجود" اور "کثرتِ موہوم" جیسے مابعد الطبیعیاتی اور بوجھل فلسفے کی تمثیل قرار دیا۔ لیکن آخر میں اپنی گفتگو کا اختتام غالب کے دوسرے مصرعے پر ہی کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ غالب کا "یاں کیا دھرا ہے" جیسے روز مرہ کے ہلکے پھلکے اور نیم طنزیہ محاورے کو اتنے بڑے فلسفے کے لیے استعمال کر جانا ہی دراصل بلاغت کا وہ کمال ہے جہاں سنجیدگی اور ظرافت ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ "یاں کیا دھرا ہے" کے الفاظ براہِ راست انسان کے اسی جذبۂ ظرافت کی عکاسی کر رہے ہیں۔

ذرا دیکھیے کہ سمندر تو اپنی جگہ ایک ہے مگر اس کی لہروں سے پیدا ہونے والے قطرے، موج اور بلبلے جو اپنی ہستی پر اتنا اتراتے ہیں، حقیقت میں اپنی کوئی الگ حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اگر سمندر کا وجود بیچ سے ہٹا دیا جائے تو ان بیچاروں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ گویا ایک ہی اصل وجود سے پھوٹنے والی یہ مختلف اور عارضی صورتیں اپنی جداگانہ ہستی کے دعوے میں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔ مگر کمال کی بات یہ ہے کہ اس تمام مضحکہ خیزی کے پردے میں انسان کے گہرے تفکر اور اعلیٰ ظرف کا پتا چلتا ہے کیونکہ یہ واقعی ایک بہت سوچنے والا مقام ہے کہ دنیا کی اکثر چیزیں بظاہر ہمیں جتنی اہم، بڑی اور پائیدار محسوس ہوتی ہیں۔ اپنی ذات میں اتنی ہوتی نہیں ہیں، بلکہ ان سب کا سرچشمہ اور مصدرِ حقیقی ایک ہی ہوتا ہے جو ان کے پس پردہ کار فرما رہتا ہے۔

گویا غالب ایک پُرظرافت تبسم کے ساتھ ہم سے یہ چبھتا ہوا سوال پوچھ رہے ہیں کہ کیا یہ بذاتِ خود ایک مضحکہ خیز بات نہیں کہ جن چیزوں کو ہم اپنی دنیا میں سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں وہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہوتیں؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود ہماری اپنی ہستی کا زعم بھی اس کائنات میں کسی لطیفے سے کم نہیں۔ ہم مادی دنیا کے ان قطروں، لہروں اور بلبلوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ مگر جیسے ہی ہمیں یہ ادراک ہوتا ہے کہ یہ ساری چہل پہل تو محض سمندر کے دم سے قائم ہے۔ تو ہمیں اپنی ہی نادانی اور معصومیت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ لیکنوجود کے اتنے بوجھل اور سنجیدہ موضوع میں پوشیدہ اس ظرافت کو پالینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت

کے پردے میں پھیلے کثرت کے یہ عارضی جلوے دراصل ہماری سوچ کو ایک ایسا تازیانہ لگاتے ہیں جو ہمیں خارجی دنیا کے فریب سے موڑ کر خود اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہم یہ سوچنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں کہ آخر اس ساری رنگینی اور جلوہ آرائی کا اصل مقصد کیا ہے؟ جیسے ہی یہ سوال ہمارے ذہن میں کوندتا ہے، ہم چیزوں کی ظاہری سطح کو چیر کر حقیقت کی گہرائی میں اترنے لگتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مادی دنیا ہمیں جس روپ میں بھی نظر آ رہی ہے، اس کی ایک ظاہری اہمیت تو ہے، مگر وہ اہمیت صرف ایک خاص حد تک ہی ہے۔ بس اسی نقطے سے، جہاں سوچ کا دھارا بدلتا ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے بصیرت کی ایک بالکل نئی دنیا طلوع ہونے لگتی ہے۔ ظاہر ہے، ادراک کی یہ اچانک اور حیرت انگیز تبدیلی جہاں ایک طرف ہمارے اندر کے 'جذبۂ ظرافت' کو بیدار کرتی ہے، وہاں دوسری طرف ہمیں اپنی سنجیدگی کی اصل قدر و قیمت پر بھی نئے سرے سے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ غالب کے اس لازوال مصرعے کی تہوں میں اگر مزید اتر کر دیکھا جائے تو یہ سچائی پوری طرح نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اگر انسان کے اندر ظرافت کی حس موجود نہ ہو تو وہ گہرے فکری حقائق تو دور کی بات مادی اشیاء کے ظاہری ڈھانچے کو بھی درست طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے اس فطری جذبۂ ظرافت کو دبا کر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ ایک مصنوعی رکھ رکھاؤ اور کھنچے کھنچے سے خول میں بند رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی زندگی داخلی طور پر کڑھی ہوئی اور گھٹی گھٹی سی ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک بہت بڑی حقیقت کھلتی ہے کہ اگر قدرت نے انسان کو ظرافت کی یہ نعمت نہ دی ہوتی تو شاید اسے کائنات کے سربستہ رازوں پر غور کرنے اور زندگی کے حقائق کو بوجھنے کی سعادت کبھی نصیب ہی نہ ہوتی۔

اس شعر کے تناظر میں اگر ذرا جنابِ سمندر کے ٹھاٹھیں مارتے وجود پر نظر ڈالی جائے، تو یوں لگتا ہے جیسے یہ حضرت خواہ مخواہ اچھلتے کودتے، شور مچاتے کنارے کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ہم اگر ان سے چٹکی لیتے ہوئے پوچھیں کہ "جنابِ سمندر صاحب قبلہ! آخر آپ ایک جگہ آرام سے کیوں نہیں بیٹھتے؟ ہر وقت اس اچھل کود میں زندگی گزارنے کی کیا تک ہے؟" تو حقیقت یہی کھلے گی کہ اگر ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ محض چند قطروں، چند لہروں اور چند عارضی بلبلوں کا مجموعہ ہی تو ہیں۔ یہاں چند سے مراد صرف دو چار یا دس بارہ نہیں۔ بلکہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہمارا اپنا ایک لطیف مذاق ہی ہے کہ ہم اتنے ڈھیر سارے قطروں اور ان پر رقص کرتے بلبلوں کو ملا کر سمندر جیسا بھاری بھرکم نام دے دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کا سارا نظام ہی اس قسم کے پُرلطف مذاق سے بھرا ہوا ہے جہاں قدرت ہر لمحہ ہمارے سامنے ملمع کاری کا یہ کھیل رچاتی ہے۔ مگر داد دیجیے ہمارے حد سے زیادہ سنجیدہ لوگوں کو، جو قدرت کے اس سارے خوبصورت اور ظریفانہ تماشے کو سمجھنے کے بجائے اسے فلسفوں اور نظریات کے الٹے سیدھے اور بوجھل نام دے کر کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں اور زندگی کے اصل تبسم کو سنجیدگی کی تہوں میں گم کر دیتے ہیں۔

غالب کا ایک اور مشہور شعر ہے:

"کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"۔5

اس شعر میں غالب نے انسان کی ایک عالمگیر نفسیاتی کمزوری کو کس طرح دلنشین اور خوبصورت انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ یہ انسانی جبلت ہے کہ وہ اپنے کسی غلط رویے یا نقصان دہ عادت کو غلط تو تسلیم کر تا ہے، مگر اس اعتراف کے باوجود خود کو سدھارنے کی زحمت نہیں کرتا۔ وہ مستقل اسی فریب میں جیتا لیکن جب بھی نیا موقع آتا ہے، وہ اپنی پرانی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہی غلطی دوبارہ دہراتا ہے۔ یوں اس کا "اس بار" بار بار لوٹ کر آتا ہے اور "آئندہ" کا دلاسہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر خود کو یہی تسلی دیتا ہے کہ بس یہ آخری خطا تھی، اب ایسا نہیں ہو گا، یہاں تک کہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے اس تاخیری رویے پر شدید پشیمانی اور ندامت کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

انسانی فطرت کی اسی ٹال مٹول اور اصلاح میں ہونے والی تاخیر کو غالب نے اپنے مخصوص ظریفانہ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس پس منظر میں وہ اپنے محبوب کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا دلبر تو ستم ڈھانے اور جفائیں کرنے کا ازل سے عادی ہے، جو اپنی قاتل اداؤں سے دل والوں کو گھائل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مگر اس بار اس نے مجھ پر جفا کا ایسا بھرپور اور زوردار وار کیا کہ میرا کام ہی تمام ہو گیا اور میری ہستی ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ غضب یہ ہوا کہ میری موت پر محبوب کو اپنی جفاؤں کا احساس تو ہوا اور اس نے توبہ بھی کی، مگر کب؟ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا! ماشاء اللہ! قربان جایئے محبوب کی اس "تیزی" پر کہ وہ پشیمان بھی ہوا تو اس وقت جب اب پچھتائے کیا ہوت کے مصداق سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ہائے اس "زود پشیماں" کا پشیمان ہونا بھی کیا پشیمان ہونا ہوا۔ اس پورے ماجرے میں سب سے کاٹ دار اور پر لطف لفظ "زود" (جلدی) کا استعمال ہے۔ یہ لفظ دراصل اس ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ محبوب نے اپنی جفاکاری سے توبہ کرنے اور شرمندہ ہونے میں اتنی "جلدی" دکھائی کہ

عاشق کا جنازہ اٹھنے کا انتظار بھی گوارانہ کیا! گویا غالب ایک گہری کاٹ دار مسکراہٹ کے ساتھ محبوب کے اس تاخیری انصاف کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ واہ صاحبِ قبلہ! آپ کی اس توبہ اور ندامت کا بھی کیا کہنا جو میری سانسیں اکھڑنے کے بعد اتنی "پھرتی" سے جاگی کہ اب مجھ میں آپ کی اس بدلی ہوئی معصومیت کو دیکھنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی۔

اس پُرلطف نکتے پر اگر غور کیا جائے تو ایک اور اچھوتی حقیقت سامنے آتی ہے کہ محبوب کی جفائیں دراصل اس کی وہ دلفریب ادائیں ہوتی ہیں جن کے بغیر عاشق کی زندگی ادھوری ہی رہتی ہے۔ چنانچہ محبوب کا جفاؤں سے سچی توبہ کر لینا عاشقوں کی برادری کے لیے کوئی اچھی یا خوش آئند خبر نہیں سمجھی جاتی۔ غالب کا اشارہ اسی طرف ہے کہ محبوب نے جو اس بار اپنی اداؤں پر شرمندگی ظاہر کی ہے، وہ دراصل اپنی ان روایتی شوخیوں اور اداؤں میں ایک ایسی تبدیلی لانے والا ہے جو عاشق کے لیے ایک نئے امتحان سے کم نہیں۔

جہاں تک غالب کے اس دوسرے شعر کا تعلق ہے، تو سچ پوچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس کی گفتگو کا آغاز کہاں سے کیا جائے کیونکہ اس ایک ہی شعر میں "شکر" کی شیرینی بھی ہے، "لطفِ خاص" کی دلکشی بھی، "پرسش" کی نزاکت بھی اور "پائے سخن" (گفتگو کا جواز) کی گہرائی بھی۔ وجہ یہ ہے کہ ان تمام نازک اور علمی الفاظ کے جھرمٹ میں ظرافت جس طرح اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ اسے پانے کے لیے واقعی ایک خاص نگاہِ التفات کی ضرورت ہے۔ بالخصوص اس ظرافت کی طرف جو انسان کے "ظرف" سے پھوٹتی ہے۔ یعنی جہاں بھی ایسی ظرافت جلوہ گر ہو سمجھ لیجیے کہ وہاں انسان کے اعلیٰ اور وسیع ظرف کا پتا چل رہا ہے۔ آگے کی گرہیں کھولنے سے پہلے غالب کا وہ لاجواب شعر سماعت فرمایئے۔ وہ یوں گویا ہیں۔

"کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں"۔٦

اب ذرا اس کے مصرعِ اول کے پہلے ٹکڑے "کس منہ سے شکر کیجیے" پر غور فرمایئے۔ بظاہر تو یہ ممنونیت کا ایک انتہائی سنجیدہ جملہ ہے مگر اس کے پس پردہ غالب کی ظریفانہ حسِ مزاح پوری طرح بیدار ہے۔ شاعر خوب جانتا ہے کہ جب آدمی دل سے کسی کا شکر ادا کرتا ہے۔ تو مسکراہٹ کے باعث بے ساختہ اس کے دانت نکل آتے ہیں۔ اب مضحکہ خیزی دیکھیے کہ بات تو سراسر سنجیدہ اور پروقار ہو رہی ہے، لیکن پوزیشن یہ بن رہی ہے کہ شکر گزار کے دانت چمک رہے ہیں، جو بظاہر ایک غیر سنجیدہ سی تصویر بناتا ہے۔ آپ ہنسنا نہیں بھی چاہ رہے، مگر وہ جو دانتوں کی نمائش ہو رہی ہے، وہ صاف بتا رہی ہے کہ اندر کوئی گہری خوشی انگڑائی لے رہی ہے اور اسی مسرت کے زیرِ اثر شکر کے کلمات ادا ہو رہے ہیں۔ دیکھیے، غالب نے کتنی خوبصورتی سے شکر گزاری کے اس نہایت سنجیدہ عمل کے اندر پوشیدہ انسانی نفسیات کی اس لطیف ظرافت کو ڈھونڈ نکالا ہے اور اسے شعر کی بنیاد بنا دیا ہے۔ آپ اسے روکنا بھی چاہتے ہیں تو وہ رک نہیں رہی۔

شعر کا اگلا ٹکڑا "لطفِ خاص کا" ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخاطب (یا محبوب) نے آپ پر کوئی عام کرم نہیں کیا، بلکہ ایک خاص اور غیر معمولی مہربانی فرمائی ہے۔ اب دیکھیے کہ وہ مہربانی کیا ہے؟ اس کا پتا ہمیں دوسرے مصرع کے پہلے ہی لفظ "پرسش" سے چلتا ہے، یعنی محبوب آپ کی خیر خیریت اور احوال دریافت کر رہا ہے۔ مگر کمالِ ظرافت اور ستم ظریفی کا عروج اگلی ہی بات میں چھپا ہے کہ "پائے سخن درمیاں نہیں"؛ یعنی حال تو پوچھا جا رہا ہے مگر زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر، محض آنکھوں کے اشاروں، ابرو کی جنبش اور کنایوں سے۔

یہ عاشق کے لیے بظاہر بہت بڑی اور افتخار کی بات ہے کہ معشوق اس کی طرف متوجہ ہے اور اس کا حال پوچھ رہا ہے، لیکن لفظوں کے سہارے کے بغیر۔ عام طور پر جب ہم کسی کا حال چال دریافت کرتے ہیں تو مروجہ الفاظ اور جملوں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن یہاں محبوب خاموش رہ کر بھی سب کچھ پوچھ رہا ہے۔ غالب نے شکر گزاری اور احوال پرسی کے اس مروجہ طریقے کو الٹ کر رکھ دیا ہے، جہاں گفتگو کا کوئی مادی وجود (پائے سخن) موجود ہی نہیں، پھر بھی ایک پورا مکالمہ سرانجام پا رہا ہے، جو سنجیدگی کے لبادے میں غالب کے ایک اور اچھوتے ظریفانہ اسلوب کی گواہی دے رہا ہے۔

جیسے ہم عام زندگی میں رسمی طور پر پوچھتے ہیں کہ "کہیے جناب! آپ کا کیا حال ہے؟ آپ کیسے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن غالب کے ہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اس شعر کے ہر ہر لفظ سے چاہے وہ "شکر" ہو، "لطفِ خاص" ہو، "پرسش" ہو یا "پائے سخن"—ظرافت اپنا جادو دکھا رہی ہے اور وہ بھی بڑے ڈھکے چھپے، لطیف اور پروقار انداز میں۔ مگر داد دیجیے کہ شعر کے آخر میں آکر "پائے سخن" (گفتگو کے پاؤں یا جواز) کے الفاظ میں ظرافت ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ محبوب ہمارا حال تو پوچھ رہا ہے، لیکن اس تمام پوچھ گچھ اور احوال پرسی میں بات کی "لات" غائب ہے، یعنی گفتگو کا کوئی ظاہری وجود یا پاؤں ہی موجود نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ غالب کی گھٹی میں ظرافت اس طرح پڑی تھی کہ یہ حضرت خود تو کبھی ان ظریفانہ اور رندانہ حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ بلکہ انہوں نے تخیل میں اپنا محبوب بھی ایسا تراشا تھا جس کی شخصیت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ایسا محبوب ہے جو عاشق کو تڑپانے اور اس کا امتحان لینے کے لیے خاموش اشاروں کا ایسا جال بنتا ہے کہ عاشق پاؤں پٹختا رہ جائے مگر گفتگو کے پاؤں نہ ڈھونڈ سکے۔ غالب اور ان کے محبوب کا یہ ذہنی تال میل ہی دراصل اس شعر کو خشک فلسفے سے نکال کر ایک اعلیٰ درجے کے ادبی اور ظریفانہ شاہکار میں بدل دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

"میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں

چل نکلتے جو مے پیے ہوتے"۔ ۷

وجہ یہ ہے کہ غالب کے اس چھیڑ چھاڑ والے انداز پر محبوب کی یہ بے رخی اور خاموشی بھی دراصل اس کے اپنے "اعلیٰ ظرف" اور ظرافت کا ایک خاموش مظاہرہ تھی۔ غالب نے تو سوچا تھا کہ وہ لفظوں کا ایسا جال پھینکیں گے کہ محبوب تلملا اٹھے گا یا کچھ بولنے پر مجبور ہو جائے گا مگر محبوب بھی آخر غالب ہی کا تراشا ہوا تھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر محض خاموشی کی چادر اوڑھ کر غالب کے پورے وار کو ہوا میں اڑا دیا۔

محبوب کا یہ نوٹس نہ لینا غالب کے دوست کی نظر میں بھلے ہی غالب کی ناکامی ہو مگر حقیقت میں یہ ظرافت کے اس کھیل کا اگلا مرحلہ ہے جہاں محبوب اپنے عمل سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ "جنابِ غالب! آپ کی یہ چالیں ہم پر نہیں چلنے والی۔" غالب کی ظرافت یہاں مات نہیں کھاتی بلکہ محبوب کی اس ادا پر ان کا جذبۂ ظرافت اور زیادہ بیدار ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ جان جاتے ہیں کہ مقابلہ برابری کا ہے اور خاموشی کی یہ پرسش، لفظوں کے طوفان سے کہیں زیادہ کاٹ دار ہے۔ ابھی غالب کا دوست کچھ کہنے کو تھا کہ غالب نے کہا جناب! ہمارا محبوب ہماری چھیڑ چھاڑ کا عادی ہے اس لئے اس کا وہ برا ماننا تو ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ میرا محبوب تو میری چھیڑ چھاڑ سے لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اگر اُس نے پی رکھی ہو اور وہ نشے میں ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محبوب ہوش وحواس میں ہو، تو پھر وہ ہماری معمولی سی چھیڑ چھاڑ پر بھی ایک ہنگامہ بپا کر دیتا ہے۔ غالب کی ظریفانہ طبیعت کے اظہار کے ضمن میں یہاں اس رنگ کو پیش کرنے کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ آپ یہ اندازہ لگا سکیں کہ غالب کس حد تک "حیوانِ ظریف" تھے اور وہ اپنی اس جبلتِ ظرافت کو کس کس اچھوتے انداز سے کام میں لاتے تھے۔ وہ جب اپنے محبوب کو چھیڑتے تھے، تو محبوب عام حالات میں ایک شریف آدمی کی طرح ان کی چھیڑ چھاڑ کا برا نہیں مانتا تھا اور خاموشی سے ٹال جاتا تھا؛ لیکن اگر وہی محبوب شراب کے نشے میں ہوتا تھا، تو پھر غالب کی اس چھیڑ چھاڑ کا ڈٹ کر اور برابر کا جواب دیتا تھا، کیونکہ نشے کی حالت میں انسان کے اندر کی جھجک ختم ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اس کے بے باکانہ اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ پاتا۔ پتا چلا کہ نشے کی حالت میں بہت شائستہ قسم کی ظرافت ہی کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہی بات کہ میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں۔ وہی بات کہ آدمی نشہ کی حالت میں زیادہ حقیقت پسند اور صاف گو ہو جاتا ہے۔

بہرحال، غالب نے اپنے محبوب کو ان دونوں حالتوں میں دیکھا تھا—ہوش وحواس میں بھی اور نشے کی سرشاری میں بھی—اور انسانی رویوں کے ان دونوں متضاد رخوں کا اظہار انہوں نے اپنے اس بظاہر سادہ سے شعر میں نہایت فنکاری سے کر دیا ہے۔ مگر شعر کی اس تمام تر سادگی کے باوجود، اس کے پس پردہ غالب کی شاعرانہ چابک دستی اپنے پورے جلوے دکھا رہی ہے، جو دیکھنے والی آنکھ کو حیران کر دیتی ہے۔ بعض اوقات تخلیقی سطح پر ظرافت کی صورت حال اس قدر لطیف، گہری اور پاکیزہ ہو جاتی ہے کہ اس کی کوکھ سے محض ہنسی مذاق نہیں جنم لیتا، بلکہ شرافتِ انسانی کے بہت سے خوبصورت، تعمیری اور مثبت پہلو نکل آتے ہیں جو انسان کو زندگی کی اصل قدروں سے روشناس کراتے ہیں۔ غالب کا ایک اور مشہور شعر ہے کہ۔

"لوں وامِ بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے

غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں"۔ ۸

غالب کے اس شعر کے بارے میں غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ۔

”واقعی خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہ فراخ حوصلگی اور شرافت نفس کا اظہار ہے اور اسے انسان کی بندگی وعبودیت کا بھی ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مل گیا، اگرچہ اس پر قناعت کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن عطا کرنے والے سے تکرار کو عبودیت کے منافی سمجھا اور شرم کے مارے چپ رہا۔“ ۹

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ غالب کے اس قدر صاف ستھرے اور پُر لطف شعر کی شارحین نے ایسی بوجھل اور ثقیل تشریح فرمائی ہے کہ شعر کا سارا تیکھا پن اور اصل لطف ہی غائب ہو گیا۔ وہی بات کہ اگر اس شعر کی تفہیم کے دوران ہم اس میں چھپے "ظریفانہ شرافت" کے پہلو کو نظر انداز کر دیں، تو شعر اپنی تمام تر صفائی اور

ستھرے پن سمیت خاک میں مل جاتا ہے اور اس میں ایک عجیب سی خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں انسان کی حسِ ظرافت نے جس طرح ایک خاص بلند حوصلگی اور شرافت کا روپ دھار رکھا ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے جب ہم اس کے پر مزاح رخ کو اوّلین ترجیح دیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دین و دنیا یعنی دونوں جہان انسان کی جھولی میں ڈال کر دینے والے خالق نے یہ سمجھا کہ کائنات میں یہی دو جہاں تو کل کائنات تھے اور وہ میں نے اسے بخش دیے ہیں۔ اب اتنا کچھ پا کر لینے والا یقیناً نہال ہو گیا ہو گا۔ لیکن دوسری طرف لینے والا انسان اگرچہ اسی خالق کی ایک عاجز مخلوق ہے۔ مگر قدرت نے اس انسان کا دل مٹی کا بنایا ہی ایسا بلند حوصلہ اور لامتناہی ہے کہ اسے کائنات کی ہر نعمت بھی لا کر دے دو۔ اس کی نیت اور طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اس کے باطن سے ہمیشہ 'ھل من مزید' (کیا کچھ اور بھی ہے؟) کی صدا ہی بلند ہوتی رہتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسد اللہ خاں غالب، دیوان غالب، فضلی سنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸۵

۲۔ الطاف حسین حالی، بحوالہ غالب بطورِ حیوان ظریف، از مشکور حسین یاد، کلاسیک لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۶

۳۔ غلام رسول مہر، بحوالہ ایضاً، ص ۱۴۶

۴۔ مولانا طباطبائی، بحوالہ غالب ایضاً، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۵۔ اسد اللہ خاں غالب، ص ۱۰۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۹۔ غلام رسول مہر، بحوالہ ایضاً، ص ۱۲۱